فقہ اسلامی کا تاسیسی پس منظر

ڈاکٹر ساجد الرحمن صدیقی

فقہ کا مفہوم فقہ کے لفظی معنی فہم و رسا اور فکر نافذ کے ہیں یعنی ایسی بصیرت و ادراک موجود ہو جس سے افعال و اعمال کی غایت اور مقصود کا علم و شعور حاصل ہو سکے۔

علامہ راغب الاصفہانی فرماتے ہیں کہ

مشاہدات کے ذریعے مغیبات کا علم حاصل کرنا فقہ ہے اور اس اعتبار سے فقہ کا لفظ علم کی بہ نسبت خاص ہے۔ بالفاظ دیگر فقہ احکام شریعت کے جاننے کا نام ہے[1]

قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔ (التوبہ: ۹: ۱۲۲)

(پس ایسا کیوں نہ ہو کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کے فہم و بصیرت کے لیے روانہ ہو جائے اور وہ واپس آکر لوگوں کو ڈرائیں تاکہ وہ گناہوں سے بچیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الجامع للترمذی ۲/۶۱۶ (ماجاء ان البینۃ علی المدعی)
سنن ابن ماجہ ۲/ (البینۃ علی المدعی)

[2] الراغب الاصفہانی المفردات۔

من یرد اللہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین[1]

اللہ سبحانہ جس شخص کے بارے میں خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین کا فہم عطا کر دیتے ہیں۔

ایک موقعہ پر آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

ان الناس لکم تبع وان رجالا یاتونکم من الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیرًا[2]

لوگ تمہارے متبع ہیں کچھ لوگ تمہارے پاس دین کی بصیرت حاصل کرنے آئیں گے تو انہیں اچھی طرح فہمائش و نصیحت کرنا۔

نیز آپ نے ارشاد فرمایا:

نضر اللہ امرءً سمع منا حدیثًا فحفظہ حتی یبلغہ غیرہ فرب حامل افقہ الی من ھو منہ ورب حامل فقہ لیس بفقیہ[3]

اللہ اس شخص کو تر و تازہ رکھے جس نے ہم سے حدیث سنی اور اسے یاد کیا اور اسے دوسروں تک پہنچایا کیونکہ بہت سے فقہ کے حامل لوگ اپنے سے زیادہ فقیہ کو پہنچا دیتے ہیں اور بعض فقہ کے حامل خود فقیہ نہیں ہوتے۔

قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ ایسی دینی بصیرت

---

[1] صحیح البخاری ۱/۲۵ طبع ترکی۔
الجامع للترمذی العلم ۲۵ تحقیق ابراہیم عطوہ الطبعۃ الثانیہ مصر ۱۹۷۵ مصر
العلامہ اشفاق الرحمٰن الکاندھلوی: کشف المغطا عن وجہ الموطا ص ۴۰۷ (باب ماجاء فی اہل القدر) طبع کراچی۔
سنن الدارمی ۱/۶۵ طبع ملتان۔ مسند الامام احمد بن حنبل ۴/۹۲

[2] الجامع للترمذی العلم ۵/۳۰۔ سنن الدارمی ۱/۶۵

[3] الجامع للترمذی العلم ۵/۳۴۔ سنن ابی داود العلم ۲/۱۲۶ (طبع بیروت)

اور قلبی دانائی کا عنوان ہے جس کی روشنی میں مفید اور مضر امور کا شعور اور مضرت رساں امور کا ادراک حاصل ہو جائے۔

معرفة النفس مالها وما عليها [1]

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عہد صحابہ میں "فقہ" کا لفظ اس محدود مفہوم میں مستعمل نہیں تھا۔ جس محدود معنی میں اس کا بعد میں استعمال شروع ہوا ہے کہ محض طلاق کی جزئیات اور بیع سلم وغیرہ کی تفصیلات کے جاننے کا نام علم فقہ ہو گیا ہے بلکہ عصر اوّل میں "فقہ" کا لفظ راہ آخرت کے علم، آفات کی پہچان، عمل کے فساد کا سبب بننے والے امور کا شعور خشیت الٰہی اور آخرت کی جانب کامل رجحان پر مشتمل تھا اور انہی امور کا شعور و ادراک "تفقہ فی الدین" متصوّر ہوتا تھا۔ قرآن کریم سے بھی اسی حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ "تفقہ" ایسی قلبی بصیرت کا عنوان ہے جو خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے تحذیر و تنبیہ کا ذریعہ بن جائے کہ خشیت الٰہی سے عاری اور زہد و تقویٰ سے تہی دامن ہو کر فقہی جزئیات میں مصروف رہنا قساوت قلبی کا سبب بن جاتا ہے [2]

امام غزالیؒ عصر نبوت اور عہد صحابہ میں فقہ کے مفہوم کی توضیح کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ:

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم اور فقہ ہم معنی کلمات ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں آیا ہے "لهم قلوب لا يفقهون بها" اسی طرح جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو نجران کا وفد آیا تو آپ نے ان کے بارے میں فرمایا "علماء فقہاء" سعد بن ابراہیم زہری سے دریافت کیا گیا کہ مدینہ منورہ میں سب سے زیادہ فقیہ کون ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا ..... زیادہ فقیہ ہے [3]

---

[1] الشیخ محب اللہ، فواتح الرحموت علی ہامش المستصفیٰ ۱/۱۰ بیروت

[2] الغزالی احیاء علوم الدین ۱/۳۲

[3] الغزالی احیاء علوم الدین ۱/۳۲

ایک عرصہ تک فقہ کا یہی مفہوم برقرار رہا لیکن اسلامی علوم میں توسع کے ساتھ ساتھ "فقہ" ان مسائل و معاملات تک محدود ہو گیا جو انسان کو زندگی میں عملاً پیش آتے ہیں جس کے نتیجے میں عقائد علم الکلام اور علم العقائد کے عنوان سے الٰہیات کا ایک جدا شعبہ قرار پائے۔ وجدانی امور تصوف اور علم الاخلاق کا حصہ بن گئے اور فقہ کا یہ اصطلاحی مفہوم مقرر ہوا۔

العلم بالاحکام الشریعۃ العملیۃ من ادلتہا التفصیلیۃ[1]

شریعت کے تفصیلی دلائل کے ذریعے عملی احکام کا علم حاصل کرنا۔

اس تعریف کے تحت فقہ کے دو حصے ہو گئے پہلا حصہ ہے شریعت کے عملی احکام کا جاننا یعنی اعتقادی اصول اور اخلاقی امور فقہ کے دائرے سے خارج ہیں جبکہ یہ تمام پہلو شریعت کے دائرے میں آتے ہیں۔ فقہ کا دوسرا حصہ ہر مسئلہ اور ہر معاملہ کے تفصیلی دلائل کا جاننا۔ مثلاً اگر یہ بیان کیا جائے کہ اسلام نے ربا (سود) کو حرام قرار دیا تو اس کے حکم کے ساتھ قرآن و سنت میں مذکور ربا کے دلائل بھی ذکر کئے جائیں اور جب یہ کہا جائے کہ راس المال پر ہر زیادتی اور اضافہ ربا ہے تو اس کے ساتھ یہ دلیل بھی بیان کی جائے کہ قرآن کریم میں ہے۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔

(البقرۃ: ۲: ۷۹)

اور اگر توبہ کر لو تو تمہارے لیے اصل مال ہے نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اسی طرح فقیہ کا یہ ذکر کرنا کہ لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا حرام ہے اس دلیل کے بیان و توضیح کے ساتھ ہونا چاہیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (النساء: ۴: ۲۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔

گویا علم فقہ کا موضوع انسانی اعمال و افعال میں سے ہر فعل کا حکم شرعی دلیل کے ساتھ

---

[1] فواتح الرحموت ۱/۱۰، علی ہامش المستصفیٰ

اس طرح معلوم کرنا ہے کہ یہ فعل و عمل جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام مستحب ہے یا مکروہ۔[1]
اس نہج پر مفصل دلائل کے ساتھ ایک متعین اور مخصوص معاملہ کا حکم جاننے کی سعی کامل کرنا اجتہاد ہے اور اس سعی و کوشش سے جو عملی حکم معلوم ہو یا مجموعہ احکام معلوم ہو وہ فقہ یا علم الفقہ کہلاتا ہے۔
غرض فقہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات و روابط سے متعلق جملہ افعال پر مشتمل ہے اور انسانی زندگی کا کوئی عملی پہلو فقہ کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کا نشو و ارتقاء

اسلام علمی تحریک اور روحانی تہذیب کا عنوان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز دعوت علم سے ہوا اور مطلوب وحی کی ان الفاظ میں توضیح کی گئی۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (ابراہیم:۱)

یہ کتاب ہے جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ۔

غرض عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وحی الٰہی ہی واحد ماخذ احکام تھی اور اجتہاد، قیاس اور اجماع ماخذ فقہ کی صورت میں بروئے کار نہیں آئے تھے، کیونکہ اس وقت ان کی بحیثیت ماخذ کے ضرورت ہی نہ تھی اور اجتہادی غلطی کی اصلاح کے لیے وحی نازل ہو جاتی تھی۔
بلاشبہ عصر رسالت میں احکام الٰہی کی معرفت کا حقیقی سرچشمہ وحی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر خود بھی اجتہاد فرمایا اور صحابہ کرامؓ کو بھی اجتہاد کی جانب راہنمائی فرمائی جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔
بہرحال عہد نبوت میں اجتہاد کا دائرہ محدود رہا اور معاملات حرب اور افراد کے جزوی

---

[1] الشوکانی: ارشاد الفحول من علم الاصول ص ۳ طبع مصر ۱۹۳۷ء۔ المفردات در کلمہ فقہ ابوزہرہ: اصول الفقہ ص ۶۰۵ دار الفکر۔

معاملات پر مشتمل رہا ان معاملات میں بھی وحی کی راہنمائی موجود تھی اور صحابہ کرام بھی جو اجتہاد کرتے اس میں آپ سے رجوع کرتے اور آپ ان کی تصویب و اصلاح فرماتے اور اس اجتہاد کا مرجع وحی اور ذات نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرار پاتے [1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمان فاتح بن کر قیصر و کسریٰ کی مملکت پر غالب آگئے اور بادشاہوں کی قائم کردہ ان رکاوٹوں کو توڑ ڈالا جو اسلام کی دعوت کا راستہ روک رہی تھیں۔ مصر، ایران، شام اور شمالی افریقہ اس وقت کی متمدن قومیں مسلمانوں کے زیر فرمان آگئی تھیں اور مملکت اسلامیہ کے بڑے بڑے شہر مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگوں سے بھر گئے۔

ذات نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے مراجعت کی صورت باقی نہ رہنے اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہو جانے کے بعد یہ امر ناگزیر ہو گیا کہ نئے اجتماعی اور سیاسی حالات میں غور و فکر کر کے ان کے فقہی حل دریافت کئے جائیں اور جدید احکام مستنبط کیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ عصر نبوت میں صحابہ کرام کو نہ اس طرح کی ضرورت پیش آتی تھی اور نہ انھیں اس طرح کے مسائل میں غور و فکر کی احتیاج پیش آتی تھی۔

الغرض پیش آمدہ پیچیدہ حالات و واقعات کے حل دریافت کرنے کے لیے صحابہ کرامؓ نے اجتہاد کیا جس کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کسی حکم کے استنباط کے لیے سب سے پہلے قرآن کریم کی جانب رجوع کرتے اگر اس میں کوئی حکم مل جاتا تو اس پر عمل پیرا ہوتے بصورت دیگر رسول اللہؐ سے منقول سنت کی جانب رجوع کرتے اور اس سلسلہ میں ان صحابہ کرامؓ سے بھی مشورہ کرتے جنہیں متعلقہ مسئلہ میں کوئی حدیث یاد ہوتی۔ اگر کسی صحابی کو موضوع سے متعلق کوئی حدیث یاد نہ ہوتی تھی تو اس صورت میں "رائے" کو اختیار کیا جاتا اور اجتہاد کر کے اور فکر و تدبر کے ذریعے سے کوئی ایسا حکم تلاش کیا جاتا جو مقاصد شریعت سے قریب تر اور شریعت کے بتائے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہوتا اور اس کے ذریعہ سے

---

[1] استاذ الشیخ خلاف اصول الفقہ ۲۸۶
محمد اسلام مذکور المدخل للفقہ الاسلامی ص ۶۷ - ۷۵

بتائے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہوتا اور اس کے ذریعہ سے شریعت کی مطلوبہ مصالح کی تکمیل ہوتی [1]

رائے کا مفہوم علامہ ابن القیم نے اپنی کتاب 'اعلام الموقعین' میں رائے کے اس مفہوم کی وضاحت کی ہے جو صحابہ کرام اس لفظ کا سمجھتے تھے۔

ایسے کسی مسئلہ میں جس میں صواب و ناصواب کے پہلو باہم معارض ہوں غور و فکر اور صحیح امر کی جانب رسائی کے لیے کوشش کے بعد جس بات پر قلب مطمئن ہو جائے وہ "رائے" ہے۔

اس لحاظ سے رائے کا مفہوم قیاس کے مخصوص فقہی مفہوم سے زیادہ وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ قیاس کے معنی یہ ہیں کہ

نص میں جس معاملے کا حکم مذکور ہے اس میں اور ایسے معاملہ میں جس میں نص موجود نہیں ہے مشترک اور جامع علت موجود ہونے کی بنا پر نص کے حکم کو اس دوسرے معاملے کے ساتھ بھی وابستہ کر دیا جائے۔

اس مفہوم کے لحاظ سے رائے کا لفظ قیاس کو بھی شامل اور استحسان اور استصلاح پر بھی مشتمل ہے۔

ابن القیم نے رائے کی تین قسمیں کی ہیں صحیح، باطل اور مشتبہ۔ انہوں نے ان اقسام کے فرق کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ صحابہ کرام سے رائے کی مذمت اور اس پر عمل کے بارے میں جو آثار منقول ہیں وہ ان میں سے کن اقسام سے متعلق ہیں [2]

لیکن اس دوسرے دور میں فقہ کا منہاج (METHOD) اپنے سابقہ دور سے زیادہ مختلف نہیں ہوا۔ بلکہ فقہ اسلامی اس دور میں عصر نبوت ہی کی طرح واقعاتی اور عملی رہا کہ عملاً جو واقعات اور حوادث پیش آتے صرف انہی کے احکام معلوم کئے جاتے اور انہی کے

---

[1] الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ف ۴۹

[2] اعلام الموقعین ۱/۶۱ ۔ الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ف ۵۰۔

بارے میں کتاب وسنت کی راہنمائی حاصل کی جاتی اور غور وفکر کے ذریعہ ان مصالح کا فہم حاصل کیا جاتا جو شارع نے ملحوظ رکھی ہیں[1]

عصر صحابہ کی خصوصیات

اس دور کی نمایاں خصوصیات کا تعلق فقہ سے نہیں بلکہ مصادر فقہ سے ہے ان خصوصیات کے دو پہلو ہیں۔

اوّل : ان واقعات اور معاملات میں جن میں اجتہاد کی روشنی میں پہلے سے احکام مستنبط نہ کیئے گئے تھے ان میں احکام کے استنباط کے لیے رائے اور قیاس کا نمایاں استعمال۔

دوم : اصول اجماع کا بروئے کار آنا، چونکہ پہلے دو خلیفہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق رضوان اللہ علیہم کا طریق کار یہ تھا کہ وہ مختلف واقعات اور حوادث میں صحابہ کرام کو جمع کرتے اور ان سے فتویٰ لیتے اور جس امر پر موجود صحابہ کا اتفاق ہو جاتا اس پر عمل کرتے تھے[2]

صحابہ کرامؓ کا اجتہاد

صحابہ کرام انتظامی اور حکومتی مسائل کے لیے اجتہاد کرتے تھے اسی طرح عائلی مسائل عقود و معاملات اور التزامات سے متعلق مسائل وامور ان کے دائرہ اجتہاد میں شامل تھے۔ اجتہاد کے مواقع پر صحابہ کرامؓ قرآن وسنت کی روح اور ان میں بیان کردہ اصولوں کو مد نظر رکھتے تھے۔ ان کے درمیان اجتہادی امور میں اختلاف بھی ہوتا تھا مگر وہ اجتہادی رائے کو حکم اللہ کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے سامنے کسی شخص نے کسی معاملہ میں حضرت علیؓ کی رائے کا حوالہ دیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو یہ فیصلہ کرتا۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ آپ امیر المومنین ہیں آپ اب بھی کر سکتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر بات قرآن وسنت کی ہوتی تو میں ضرور کرتا لیکن یہ معاملہ رائے کا ہے مجھے نہیں معلوم کہ کون سی رائے درست اور حق ہے۔

---

[1] الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ف ۵۰

[2] ایضاً

صحابہ کرام کے یہاں اجتہاد کی تین صورتیں تھیں۔
۱۔ قرآن وسنت کی نصوص کا بیان اور ان کی توضیح
۲۔ کتاب وسنت میں مذکور یا اجماع سے ثابت شدہ نظائر پر قیاس
۳۔ قرآن وسنت کی روح اور انہیں بیان کرنے والے اصولوں پر اعتماد کرتے ہوئے اجتہاد بالرائے[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کا اسلوب

حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے مختلف واقعات میں ایسے نمایاں اجتہادات کئے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ اس عظیم خلیفہ کی فقہی عبقریت وبصیرت ظاہر ہوتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اجتہادات فقہ کا منہاج اور دستور بننے کے لائق قرار پاتے ہیں۔

حضرت عمر کے اجتہادات کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

مؤلفۃ القلوب مولفۃ القلوب کو بیت المال سے اس مقررہ حصہ میں سے جو باقاعدہ روزینہ مل رہا تھا اور جو قرآن سے ثابت تھا، حضرت عمر نے اپنے دور میں موجود ان مولفۃ القلوب کو یہ حصہ دینا بند کر دیا۔ درآنحالیکہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے یہ روزینہ حاصل کر رہے تھے۔

حضرت عمر کی نظر قرآن کریم کے حکم کے ظاہر پر نہیں تھی بلکہ وہ اس کی علت پر نظر رکھے ہوئے تھے جو یہ تھی کہ جس وقت اسلام کمزور تھا اس وقت ان لوگوں کو دیا جاتا تھا تاکہ ان کے شر سے بچا جاسکے۔ لیکن جب اسلام مضبوط ہوگیا اور مسلمانوں نے قوت وشوکت حاصل کر لی تو اب ان لوگوں کو دینے کا یہ داعیہ باقی نہ رہا۔ مزید یہ کہ قرآن نے بعض متعین اور مقررہ لوگوں کو اس حصہ میں سے دینے کا حکم نہیں فرمایا۔

قحط کے زمانے میں حد سرقہ کا عدم اجراء حضرت عمر رضؓ نے اجتہاد فرمایا اور قحط کے سال میں چوری کی حد کا نفاذ موقوف کر کے تعزیری

---

[1] المدخل الی الفقہ الاسلامی ص ۸۲

سزا جاری فرما دی ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے چوری کی مقررہ حد معطل کر دی بلکہ درحقیقت یہ سزا کی تطبیق کی شرائط کے بارے میں ایک بڑا حکیمانہ اجتہاد ہے ۔ کیونکہ از روئے شریعت حد سرقہ کے جاری کرنے کی شرط یہ ہے کہ سارق چوری کرنے پر مجبور نہ ہو گیا ہو حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ قحط کا ہونا لوگوں کے لیے ایک ایسی اضطراری مجبوری کی حالت ہے جس کے تحت آدمی چوری پر مجبور ہو سکتا ہے اور اس طرح کی اضطراری کیفیت شبہ کے زمرہ میں آتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ۔

ادرؤا الحدود بالشبہات ۔

حدود کو شبہ کی بنا پر ساقط کر دیا کرو ۔

مفقود الخبر شوہر کا مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفقود شوہر کی بیوی کے نکاح کو شوہر کی گمشدگی کے چار سال بعد ختم قرار دیا اور اس کے فی الواقع مر جانے کی تحقیق یا اس کے ہم عمروں کے انتقال کر جانے کی شرط کو ختم کر دیا ۔

عراق کی مفتوحہ اراضی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اجتہاد فرمایا کہ سواد عراق اور مصر کی زمینیں مجاہد فاتحین میں تقسیم نہ کی جائیں جبکہ ان مجاہدین کا مطالبہ تھا کہ مفتوحہ زمینیں اسی طرح تقسیم کی جائیں جس طرح کہ خمس نکالنے کے بعد تمام زمینیں تقسیم کی جاتی ہیں کیونکہ قرآن و سنت کی ظاہری نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ ان مفتوحہ علاقوں کی زمینیں بھی جنگی غنیمتیں ہیں اس لیے انہیں بھی فاتحین میں تقسیم ہونا چاہیے ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اس کے برخلاف تھی ان کی رائے یہ تھی کہ یہ زمینیں فئے ہیں اور ان سے تمام موجود اور آنے والے مسلمانوں کے حقوق متعلق ہیں تاکہ بیت المال سے لینے والے تمام مسلمانوں کے حقوق اور مصلحت کی حفاظت ہو سکے ۔ اس رائے کی تائید قرآن و سنت کے تمام احکام کو پیش نظر رکھ کر صائب غور و فکر سے حاصل شدہ رائے سے ہوتی ہے ۔ بہرحال حضرت عمرؓ نے یہ تمام زمینیں ان کے سابق مالکوں کے پاس رہنے دیں اور ان پر خراج عائد کر دیا کیونکہ حضرت عمر کی رائے کے مطابق یہ طریقہ زمینوں کے آباد کرنے کے لیے زیادہ مناسب

اور موزوں تھا اور اس کی منفعت زیادہ عام اور دائمی تھی۔

سورۃ الانفال میں ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (الانفال: ۴۱)

اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لوٹ لاؤ تو اس میں سے پانچواں حصّہ خدا کا اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا ہے۔

اس آیت میں جنگی غنیمتوں کے خمس کے عام مصارف بیان کیے گئے ہیں جبکہ باقی غنیمت کی تقسیم کی کیفیت سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر دی ہے بعد ازاں سورۃ الحشر میں فئے کے بارے میں یہ آیت ہے۔

ما افاء الله على رسوله من اهل القرى فلله وللرسول ولذى القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل كى لايكون دولة بين الاغنياء منكم وما اتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا واتقوا الله ان الله شديد العقاب ۝ للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلاً من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله، اولئك هم الصادقون۝ والذين تبوؤا الدار والايمان من قبلهم يحبون من هاجر اليهم ولا يجدون فى صدورهم حاجة مما اوتوا ويوثرون على انفسهم ولوكان بهم خصاصة ومن يوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون ۝ والذين جاؤا من بعد هم يقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان ولا تجعل فى قلوبنا غلا للذين امنوا ربنا انك رؤف رحيم ۝ (الحشر، تا ۱۰)

جو مال خدا نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ خدا کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے اور یتیموں کے اور حاجت مندوں کے

اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔ سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو اور خدا سے ڈرتے رہو بے شک خدا سخت عذاب دینے والا ہے۔ اور ان مفلسان تارک الوطن کے لیے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیے گئے ہیں اور خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور خدا اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں یہی لوگ سچے (ایماندار ہیں۔ اور ان لوگوں کے لیے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے اور انہیں اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو اور جو شخص حرص سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (و حسد) نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

ان آیات سے اس مفہوم کی جانب اشارہ ہوتا ہے کہ فئے مجاہدین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام آنے والے مسلمانوں کا بھی اس میں حق ہے۔ اس لیے اموال فئے بیت المال میں جمع کیے جائیں گے۔

شرعی اصطلاح کی رو سے غنیمت اور فئے میں فرق یہ ہے کہ غنیمت وہ ہے جو برسرپیکار دشمن سے ہتھیاروں کی قوت کے ذریعے حاصل کی گئی ہو جبکہ فئے وہ مال ہے جو دشمن مسلمانوں سے مرعوب ہو کر خود چھوڑ گئے ہوں یا مسلمانوں کے غلبہ اور قوت کے تحت انہوں نے مسلمانوں کو دیدیا ہو مگر اس مال کے حصول کے لیے جنگی معرکوں میں گھوڑے دوڑانے اور لشکر کی قوت کے اظہار کا موقع نہ ملا ہو۔ اسی لیے فئے میں وہ ٹیکس بھی داخل ہیں جو غیر مسلم افراد سے جزیے کی صورت میں

اور ان کی زمینوں پر عائد خراج کی صورت میں حاصل ہوئے ہوں۔

سنت نبی کریمؐ سے یہ بات ثابت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا تو خیبر کی زمین غلبہ اور قوت سے فتح ہوئی تھی صلح کے ذریعے فتح نہیں ہوئی تھی اور خیبر کے لوگوں نے جلاوطنی کا حکم قبول کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ دریں صورت خیبر کی یہ زمین مفئے شمار کی گئیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نصف حصّہ یا خمس خاص حادثات اور واقعات کے لیے علیحدہ کر لیا اور باقی حصّہ فاتحین میں تقسیم کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں سوادِ عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو فاتح سپاہیوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ ان زمینوں کو غنیمت کی طرح تقسیم کیا جائے۔ حضرت عمرؓ اس رائے کے قائل تھے کہ ان زمینوں کی تقسیم درست نہیں ہے چنانچہ آپ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ کیا۔ عام صحابہ کرام کی رائے تقسیم کے حق میں تھی ماسوا حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل کے، کہ ان صحابہ کرامؓ کی رائے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق تھی چنانچہ حضرت معاذؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا:

> کہ اگر آپ نے ان اراضی کو ان لوگوں میں تقسیم کر دیا تو یہ عظیم دولت ان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور بعد میں یہ اسے ضائع کر دیں گے اور رفتہ رفتہ ساری زمین کسی ایک شخص یا عورت کے پاس پہنچ جائے گی لیکن بعد میں جو لوگ ایسے آئیں گے جو اسلام کی خاطر خدمات انجام دیں گے اور آزمائش میں پڑ کر سرخرو ہوں گے ان کے لیے کچھ باقی نہیں بچے گا۔ اس لیے آپ کوئی ایسی رائے اختیار کیجیے جس میں اگلوں پچھلوں سب کا بھلا ہو۔

الغرض فاتح لشکر کی اکثریت نے اس امر پر اصرار کیا کہ ان زمینوں سے خمس نکال کر تمام زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں مگر حضرت عمر اس تقسیم سے باز رہے۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ گرد و نواح کے عظیم علاقے پہلے ہی فتح ہو چکے ہیں اور یہ زمینیں مفئے کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے فاتح سپاہی ان کی عینی ملکیت کا استحقاق نہیں رکھتے بلکہ امام کے لیے ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے مفید اور زیادہ موزوں طریقہ کار اختیار کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینیں اس لیے تقسیم فرمائیں کہ اس وقت لوگوں کو ان زمینوں کی ضرورت تھی اور اس وقت یہی عمل مصلحت کے مطابق تھا۔

کئی روز تک اس موضوع پر گفتگو جاری رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے سورۃ الحشر کی متعلقہ آیت کے آخری حصہ سے یہ دلیل مل گئی ہے کہ بعد میں آنے والے لوگ بھی اس فئے کے مستحق ہیں۔

والذین جاؤا من بعدھم ۔

اور ان کے لیے بھی جو ان مہاجرین کے بعد آئے ۔

حضرت عمر نے فرمایا کہ میری نظر میں یہ آیت عام ہے اور تمام مسلمانوں کو مشتمل ہے۔ یہانتک کہ اس میں وہ چرواہا بھی شامل ہے جو مکہ کے پہاڑ پر اپنی بکریاں چرا رہا ہے ۔ بعدازاں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بعد میں آنے والوں کے لیے کچھ بھی باقی نہ رہے ۔ اگر یہ صورت ہوتی کہ ہم ہی سب سے آخر میں ہوتے تو جو بھی بستی فتح ہوتی اس کو اس طرح تقسیم کر دیتا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی تقسیم فرمائی ۔

الغرض حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ زمینیں اور نہریں ان کے سابقہ کاشتکاروں ہی کے پاس رہنے دیں اور ان پر خراج عائد کر دیا ۔ بعدازاں آپ نے حکم دیا کہ مصر کی زمینوں کا بھی یہی معاملہ کیا جائے کیونکہ مصر کی زمینوں کے بارے میں بھی اس طرح کا اختلاف حضرت عمرو بن العاص امیر مصر اور حضرت زبیر بن العوام کے درمیان رونما ہو چکا تھا [1]

فقہ کی اشاعت خلیفہ سوم حضرت عثمان کے عہد میں صحابہ کرام اسلامی ریاست کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے تھے اور دور دراز کے شہروں میں جا کر بس گئے تھے جبکہ حضرت عمر انہیں مدینہ منورہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ حضرت عمر کی یہ خواہش تھی کہ صحابہ کرام مدینہ منورہ میں موجود رہیں تاکہ بوقت ضرورت ان سے مشورہ کیا جاسکے۔

صحابہ کرامؓ حجاز، یمن، عراق، مصر اور شام کے جن علاقوں میں پہنچے وہاں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور احکام شریعت لے کر گئے اور ان تمام شہروں میں تابعین نے

---

[1] فتح الباری : ۶/ ۳۸ ۔ ابو یوسف، الخراج ص ۳۳ ۔
مصطفیٰ احمد زرقا، الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ف ۵۲
الدکتور حسن علی الشاذلی ، المدخل للفقہ الاسلامی ۱۶۹

آپ سے علم حاصل کیا۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امت مسلمہ میں "الدین" "العلم" اور "الفقہ" کی اشاعت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ کے ذریعہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ عامۃ المسلمین تک علم فقہ انہی چار کے تلامذہ کے ذریعہ پہنچا ہے۔ چنانچہ اہل مدینہ نے حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت اللہ بن عمرؓ اور ان کے تلامذہ کے علم سے استفادہ کیا۔ اہل مکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ سے فیض یاب ہوئے اور اہل عراق نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علم سے استفادہ کیا۔ عبداللہ بن عمر اور آپ کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم صحابہ کرام ایسے مسائل میں جن میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ ہوتی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی رائے کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔

ایک موقعہ پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ فرائض (میراث) کے مسائل حضرت زید بن ثابت سے دریافت کئے جائیں اور فقہی معاملات میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے استفادہ کیا جائے۔

غرض حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ جیسے کبار صحابہ کے گہرے علمی اور دینی اثرات مرتب ہوئے اور انہوں نے فقہی مکاتب فکر کے قیام کی طرح ڈالی اور ان کے شاگرد تابعین ان مکاتب فکر کے قائد اور آئمہ قرار پائے۔ جیسے مدینہ منورہ میں سعید بن المسیب، مکہ میں حضرت عطا بن ابی رباح، کوفہ میں حضرت ابراہیم نخعی، بصرہ میں حضرت حسن بصری، شام میں مکحول، یمن میں حضرت طاؤس۔ ان تمام اصحاب کے ذریعے سے اور ان کے بعد آنے والے تبع تابعین کے ذریعے سے فقہ اسلامی میں مختلف مکاتب فکر کا رجحان پیدا ہوا اور آگے بڑھا، کیونکہ ان میں سے ہر تابعی اس صحابی کی فقہ اور طریقہ اجتہاد سے متاثر تھا جس صحابی کے ساتھ اس کا تعلق رہا اور جس سے اس نے علم حاصل کیا لہ

موضوعات فقہ کی تقسیم

فقہاء کرام نے فقہ کے موضوعات کو اولاً دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کو وہ عبادات کا عنوان دیتے ہیں

لہ الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ف ۵۳

جن میں نماز، حج اور زکوٰۃ اور دیگر متعلقہ موضوعات آتے ہیں۔ دوسرے کو انہوں نے "عادات" کا عنوان دیا ہے جو عبادات کے علاوہ جملہ احکام یعنی جنایات سیر اور مواریث پر مشتمل ہے۔

شافعی فقہاء کہتے ہیں کہ احکام شریعت میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق آخرت سے ہے۔ احکام کے اس حصّہ کو "عبادات" کہا جاتا ہے جبکہ باقی احکام کا تعلق دنیا سے ہے۔ دنیاوی امور سے متعلق شریعت اگر انسان کے وجود کی بقاء سے منسلک ہیں تو انہیں "معاملات" کہا جائے گا۔ جیسے تجارت اور معاشرتی زندگی سے متعلق دیگر امور۔ بعد ازاں اگر معاملات سے متعلق احکام انسانی نوع کی بقاء کے بارے میں ہیں تو عقد زواج کے زمرے میں آتے ہیں اور مناکحات کہلاتے ہیں جبکہ جرم و سزا کو عقوبات کے زیر عنوان بیان کیا جاتا ہے[1]

حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی نے فقہ کے تین شعبے ذکر کئے ہیں عبادات، معاملات اور عقوبات۔

عبادات پانچ ہیں:

صلاۃ، زکوٰۃ، صیام، حج اور جہاد۔

عادات پانچ ہیں:

مالی معاوضات، امانات، زواج، مخاصمات اور ترکات۔

عقوبات پانچ ہیں:

قصاص، حد سرقہ، حد زنا، حد قذف اور ارتداد[2]

ڈاکٹر احمد مصطفیٰ زرقاء نے احکام فقہ کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ عبادات

یعنی وہ احکام جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی عبادات سے ہو مثلاً صلوٰۃ، صوم اور زکوٰۃ وغیرہ۔

---

[1] حسن علی الشاذلی المدخل للفقہ الاسلامی ص ۱۲ الکویت ۱۹۷۷ء

[2] ابن عابدین، ردالمحتار ۱/ ۵۶

٢ ۔ احوال شخصیہ :
عائلی زندگی سے متعلق احکام مثلاً نکاح ، طلاق ، نسب نفقہ وغیرہ ۔

٣ ۔ معاملات :
وہ احکام جن کا تعلق لوگوں کے افعال ، اموال اور حقوق سے ہو اور ان امور سے متعلق پیش آنے والے باہمی معاملات اور نزاعات کے فیصلوں سے ہو ۔

٤ ۔ سیاست شرعیہ :
وہ احکام جن کا تعلق رعایا پر حاکم (حکمران) کے اقتدار سے ہو اور رعایا اور حکمران کے حقوق وفرائض سے ہو ۔ اس شعبہ کو بعض فقہاء نے "السیاسۃ الشرعیہ" کہا ہے اور بعض نے "الاحکام السلطانیہ" کا نام دیا ہے ۔
دور جدید کی قانونی اصطلاح کے مطابق یہ امور قانون کے دو شعبوں میں بیان کیے جاتے ہیں "تنظیمی قوانین" اور "دستوری قوانین"

٥ ۔ عقوبات :
وہ احکام جن کا تعلق مجرمین کی سزا اور داخلی نظم ونسق سے ہو ۔

٦ ۔ سیر :
وہ احکام جن کا تعلق اسلامی ریاست کے دیگر ریاستوں سے تعلقات سے ہو اور جو صلح وجنگ کے نظام و قوانین پر مشتمل ہو ۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح اور شعبہ قانون کو "سیر" کہا جاتا ہے اور یہ لفظ "سین" کے زیر اور "یا" کے زبر کے ساتھ ہے اور "سیرۃ" کی جمع ہے جبکہ آج کل کے قوانین کی اصطلاح میں اسے "بین الاقوامی قانون (انٹرنیشنل لا) کہا جاتا ہے ۔

٧ ۔ آداب
وہ احکام جن کا تعلق اخلاق حسنہ اور برے اخلاق سے ہو[1]

---

[1] ڈاکٹر احمد مصطفیٰ زرقاء ، الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ف ٢

فقہ اسلامی اور قانون

فقہ اسلامی کے موضوعات کی تقسیم اگرچہ جدید قوانین کی تقسیم موضوعات کے مطابق نہیں ہے لیکن فقہ اسلامی ان تمام موضوعات پر مشتمل ہے جو دور جدید کے قوانین کی ہر دو اقسام قانون عام اور قانون خاص کے تمام اجزاء پر مشتمل ہے۔

قانون عام کی دو قسمیں ہیں :

قانون عام خارجی ۔

قانون عام داخلی

قانون عام خارجی سے مراد قانون بین الممالک یا بین الاقوامی قانون ہے اور اس سے مراد وہ قواعد وضوابط ہیں جن کو دنیا کے ممالک اپنے زمانہ جنگ اور زمانہ امن کے تعلقات میں مدنظر رکھتے ہیں ۔ فقہ اسلامی کا یہ ایک اہم موضوع ہے اور فقہاء کرام اپنی تالیفات میں مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ صلح و جنگ کے احکام بالتفصیل بیان کرتے ہیں اور بین الممالک دائمی معاہدات اور وقتی اتفاقات کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے ان معاہدات و اتفاقات کی جزئیات بیان کرتے ہیں اور ان شرائط اور اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں جب معاہدات کی پابندی لازم نہیں رہتی اور ان کو ختم کر دینا قانونی قرار پاتا ہے۔ کتب فقہ میں یہ موضوع "السیر" یا "الجہاد" کے عنوان کے تحت مذکور ہوتا ہے ۔

نہ صرف یہ کہ کتب فقہ میں یہ موضوع دیگر موضوعات کے ساتھ بیان ہوتا ہے بلکہ بعض فقہاء نے خاص اس موضوع پر علیحدہ تصانیف بھی تحریر فرمائی ہیں مثلاً امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی نے اولاً السیر الصغیر تالیف کی اور بعد ازاں اس موضوع کو مزید وسعت دیتے ہوئے السیر الکبیر تالیف فرمائی ۔ اسی طرح امام اوزاعی کی تصنیف 'السیر' اور امام ابو یوسف کی کتاب 'الرد علی سیر الاوزاعی' ہے ۔

قانون داخلی سے مراد کسی ملک میں مروج قانون ہے اس کی حسب ذیل انواع ہیں ۔

قانون دستوری

قانون اداری

قانون مالی

قانون جنائی

دستوری قانون سے مراد قانون کا وہ حصّہ ہے جس میں ریاست کے نظام کی تحدید کی جاتی ہے اور ہئیت مقتدرہ عام کی تنظیم بیان کرکے ہئیت حاکمہ کے اختیارات بیان کئے جاتے ہیں۔ اور ریاست میں رہنے والے افراد کے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ فقہاء کرام نے اس موضوع پر "السیاسۃ الشرعیۃ" اور "الاحکام الشرعیۃ" کے عنوان سے جداتالیفات کی ہیں اس موضوع کی بعض اہم تصانیف حسب ذیل ہیں :

الف : ابوالحسن الماوردی الشافعی (م ۴۵۰ھ) کی الاحکام السلطانیہ اور قانون الوزارۃ والملک۔

ب : قاضی ابویعلی الحنبلی م ۴۵۸ھ کی الاحکام السلطانیہ۔

ج : ابن تیمیہ الحنبلی م ۷۲۸ھ کی السیاسۃ الشرعیہ۔

قانون اداری سے مراد وہ مجموعہ ضوابط ہے جو ہئیت مقتدرہ کے اختیارات کے استعمال اور ان کی جانب سے مرافق عامہ (PUBLIC UTILITES) کی تکمیل کے لیے وضع کئے جاتے ہیں۔

فقہاء کرام نے اس موضوع کو بھی "الاحکام السلطانیۃ" اور السیاسۃ الشرعیہ کے تحت ذکر کیا ہے۔

قانون مالی سے مقصود قانون کا وہ حصّہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ ریاست کی مالیات کی تنظیم کی جاتی ہے۔ آمد کے ذرائع اور صرف کی ترجیحات معین کی جاتی ہیں۔

کتب فقہ میں علی العموم یہ موضوع کتاب الزکوٰۃ اور الخراج میں بیان ہوا ہے جبکہ بعض فقہاء کی اس موضوع پر علیحدہ تصانیف بھی موجود ہیں مثلاً

ابویوسف کی کتاب الخراج۔

یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج۔

ابن زنجویہ کی کتاب الاموال۔

ابوعبید کی کتاب الاموال۔

قانون جنائی (فوجداری قانون) میں جرائم اور ان کی سزاؤں کا بیان ہوتا ہے۔ کتب فقہ میں قانون کے اس حصّہ کا بیان الجنایات الحدود اور التعزیر کے عنوانات کے تحت کیا جاتا ہے۔

قانون خاص ان اقسام پر مشتمل ہے۔

قانون مدنی
قانون تجارت
قانون مرافعات
اور قانون دولی خاص

قانونِ مدنی (سول لا) میں افراد کے باہمی مالی معاملات کی نوعیت کو بیان کیا جاتا ہے فقہاءِ کرام نے اس موضوع کو کتب فقہ کے المعاملات کے حصّہ میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔ نیز قانون مدنی میں فرد کے خاندان کے تعلقات کا ذکر ہوتا ہے جسے 'احوال الشخصیہ' کہا جاتا ہے۔ فقہاء کے ہاں یہ تفصیلات نکاح و طلاق میں ملتی ہیں۔

قانون تجارت یا تجارتی قانون ان قواعد و ضوابط کو کہا جاتا ہے جو افراد معاشرہ کے باہمی تجارتی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ فقہاء کے یہاں یہ مباحث الشرکات مضاربہ اور تفلیس کے کے ابواب میں ملتے ہیں۔

قانون مرافعات کا مفہوم ہے وہ قواعد اور طریقے جو تجارتی اور مدنی قانون کی تطبیق کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ کتب فقہ میں یہ اصول و قواعد قضاء دعویٰ اور شہادت کے ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔

قانون دولی خاص کا وہ حصّہ ہے جو غیر ملکی لوگوں کے مقدمات کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور ان کے لیے جدا عدالتیں مقرر کرتا ہے۔

فقہاء نے اس حصّہ قانون کو کتب فقہ میں السیر کے زیر عنوان بیان کیا ہے بعض فقہی کتب میں یہ موضوع احکام اہل الذمۃ والمستامنین والحربیین کے باب میں مذکور ہوتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کی احکام اہل الذمہ کے نام سے اس موضوع پر مستقل تالیف بھی موجود ہے[1]

اصول فقہ اصول فقہ جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے دو کلمات سے مرکب ہے۔ فقہ اور اصول۔ اصول اصل کی جمع ہے جس کے معنی قاعدہ اور اساس کے ہیں اس اعتبار سے اصول فقہ کے معنی ہوئے

---

[1] حسن الشاذلی المدخل للفقہ الاسلامی ۱۶ الکویت ۱۹۷۷ء

ایسے قواعد وضوابط جن پر فقہ استوار ہوتا ہو اور جن کے فہم پر دلائل کے ذریعہ سے استخراج احکام کا عمل ممکن ہو۔ اس اعتبار سے اصول فقہ دراصل فقہ کے ان دلائل کا نام ہے جن کی مدد سے احکام شریعہ کے فہم میں مدد ملے اور یہ معلوم ہو کہ کس طرح دلائل کے ذریعے سے احکام کا ثبوت میسر آرہا ہے[1]

ابن الہمام نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

ادراك القواعد التى يتوصل بها الى استنباط الفقه[2]

(ان قواعد کا جاننا جن کے ذریعے استنباط فقہ تک رسائی ہوتی ہے)

غرض ایسے طریقے اور مناہج اور قواعد جو فقہی احکام کے اخذ کرنے اور ان کے دلائل فراہم کرنے میں مدد دیں اصول فقہ کہلاتے ہیں اور اس علم کو علم اصول الفقہ کہا جاتا ہے۔

اصول فقہ کا موضوع

فقہ کے اجمالی دلائل ان کی ترتیب استناد اور ان کی اہمیت و حجیت اور دیگر متعلقہ امور علم اصول فقہ کا موضوع ہیں۔ اس اعتبار سے علم اصول فقہ میں استنباط کے طریقوں کے بیان اور دلائل استنباط پر مشتمل ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ قرآن کریم سنت پر مقدم ہے اور قرآن و سنت باقی تمام طرق استدلال اور مناہج استنباط پر فائق اور مقدم ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن و سنت کی توضیح و تشریح کے اصول اور تعارض نصوص کی صورت میں تطبیق و ترجیح کے قواعد کا بیان بھی اصول کا موضوع ہیں[3]

---

[1] الآمدی، الاحکام فی اصول الاحکام ۱/ ۸ طبع بیروت
ابوزہرہ، اصول الفقہ ص ٦۔ فواتح الرحموت ۱/ ۹
علی حسب اللہ، اصول التشریع الاسلامی ص ۲
حسن الشاذلی، المدخل للفقہ الاسلامی ص ۳۷۴

[2] محمد امین المعروف بامیر بادشاہ، تیسیر التحریر ۱/ ۱۴ طبع مصر ۱۳۵۰
الشوکانی، ارشاد الفحول ص ۳۔

[3] الاحکام فی اصول الاحکام ۱/ ۹۔

اصول فقہ کا نشو و ارتقاء

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں جس طرح فقہ وجود میں آچکا تھا اسی طرح اس کے اصولوں کی نشو و نما کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب اجتہاد کے مواقع پر اصول استنباط پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے مے نوشی کی حد کے لیے صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو حضرت علیؓ کا طرز استدلال یہ تھا کہ مے نوشی ایک ایسا عمل ہے جس سے انسان کا شعور و احساس ختم ہو جاتا ہے اور اس کی عقل جاتی رہتی ہے اس عقل و شعور سے خالی نشہ کی کیفیت میں انسان ہذیان بکنا شروع کر دیتا ہے عین ممکن ہے کہ ہذیان بکنے کی صورت میں وہ ایسے الفاظ بھی کہہ دے جو قذف (تہمت) کے الفاظ ہوں اس لیے قرآن کریم میں بیان کردہ قذف کی سزا (اسی کوڑے) جرم مے نوشی کی بھی سزا متعین کر دی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی نے مے نوشی کی سزا جرم قذف کی سزا کے برابر مقرر کرنے کے ضمن میں اپنے استدلال کی اساس حکم بالمآل اور سد الذرائع کو بنایا کہ چونکہ مے نوشی میں نشہ کی کیفیت قذف کو بھی منتج ہو سکتی ہے اس لیے اس ذریعہ کا سد باب کرتے ہوئے جو مآل (انجام) کا حکم ہے وہ اس صورت پر عائد و منطبق کر دیا جائے[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس موقعہ پر یہ استدلال کیا کہ قرآن و سنت کی متعین کردہ حدود کی سزاؤں میں سب سے کم سزا قذف کی حد ہے۔ اس لیے کم ترین حد کی سزا کو اس جرم مے نوشی کی حد قرار دے دیا جائے[2]

اس سے معلوم ہوا کہ حد کا یہ مفہوم کہ یہ کسی جرم کی وہ سزا ہے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہو صحابہ کرامؓ کے درمیان متعارف تھا۔

قرآن کریم میں سورۃ البقرۃ میں ایسی عورتوں کی عدت جن کے شوہر وفات پا جائیں چار ماہ

---

[1] کشف المغطاء عن وجہ الموطا ص ٦٩۔ ابو زہرہ اصول الفقہ ۹

[2] صحیح مسلم (الحدود) ۱۳۳۱/۳ تحقیق محمد فواد عبدالباقی بیروت

دس دن بیان ہوئی ہے اس مقام پر عدت کا حکم عام بیان ہوا ہے یعنی تمام ایسی خواتین جن کے شوہر وفات پا جائیں چار ماہ دس دن عدت گزاریں اور سورۃ طلاق میں حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جب اس عورت کی عدت کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کا شوہر وفات پا جائے اور وہ حاملہ ہو تو آپ نے فرمایا کہ اس کی عدت وضع حمل ہے کیونکہ سورۃ طلاق سورۃ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ہے گویا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ بعد میں آنے والا حکم پہلے حکم کی تخصیص کر دیتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر کوئی چاہے تو میں اس موضوع پر مناظرہ بھی کر سکتا ہوں کہ سورۃ الطلاق جس میں مطلقہ عورتوں کی عدت کا بیان ہوا ہے سورۃ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ہے[1] صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

اتجعلون علیہا التغلیظ ولا تجعلون لہا الرخصۃ[2]

سختی کا پہلو کیوں روا رکھتے ہو، رخصت کا پہلو کیوں نہیں اختیار کرتے۔

گویا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس مسئلہ میں یہ اصول بھی بیان فرمایا کہ اسلامی شریعت رخصت اور سہولت کے پہلو کے ترجیح دینے کو بہ نظر استحسان دیکھتی ہے۔

حضرت ابی بن کعب کے ذہن کی رسائی اس امر کی جانب عہد نبوت ہی میں ہو گئی تھی کہ سورۃ الطلاق میں حاملہ عورت کی عدت کے حکم کا اطلاق البقرہ میں وارد حکم عام پر بھی ہوگا اور یہ بات انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان فرمائی تو آپ نے استصواب فرمایا[3]

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام قرآن کی نصوص اور ارشادات نبوت کی تصریحات سمجھنے کا طبعی سلیقہ اور ملکہ رکھتے تھے اور وہ بخوبی واقف تھے کہ قرآن کریم میں اور سنت نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں

---

[1] کشف الغطا عن وجہ المؤطا ص ۵۳۰۔ الصحیح للبخاری ۵/ ۱۶۱/ طبع ترکیا۔
مصنف عبدالرزاق ۶/ ۴۷۱۔ الجصاص احکام القرآن ۱/ ۴۱۵ بیروت۔

[2] الصحیح للبخاری ۱۶۱۱۔

[3] مصنف عبدالرزاق ۶/ ۴۷۲۔

کون سی تعبیرات عام وارد ہوئی ہیں اور ان کی کہاں اور کس انداز میں تخصیص یا تقیید وارد ہوئی ہے اور کون سے کلام کا محل اور اطلاق کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امر کے باوجود کہ امور استنباط اور مناہج اجتہاد مدون صورت میں موجود نہ ہونے کے باوجود وہ ان اصول کا فطری طریقے پر اطلاق کرتے تھے یعنی اگرچہ صحابہ کرامؓ صراحتاً اصول بیان کر کے استنباط اور اجتہاد نہیں کرتے تھے مگر ان کے سامنے اصول و مناہج رہتے تھے اور ان کا اجتہاد اصول و قواعد کی روشنی میں ہوتا تھا۔

دور صحابہ کے بعد تابعین کے زمانے میں واقعات و مسائل کے تنوع کی بنا پر اجتہاد کا عمل اور استنباط احکام کے اصول کا دائرہ بھی وسیع تر ہو گیا۔ مدینہ منورہ میں حضرت سعید بن المسیب اور عراق میں علقمہ اور ابراہیم نخعی جیسے فقہاء اجتہاد و فتویٰ کے فرائض انجام دے رہے تھے ان کے پیش نظر قرآن کریم اور سنت رسول کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ بھی موجود تھے اور یہ حضرات استنباط میں مصلحت اور قیاس کے اصول بھی اختیار کرتے تھے۔

تابعین کے بعد ائمہ مجتہدین کے زمانے میں استنباط کے مناہج اور اجتہاد کے اصول زیادہ واضح ہو گئے اور فقہاء واضح اور صریح عبارتوں میں ان اصولوں کو بیان بھی کرنے لگے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کتاب و سنت، اور صحابہ کرام کی متفقہ اور اجماعی آراء کو مدنظر رکھتے تھے اور جن امور کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تو انہی آراء میں سے اپنے نزدیک کسی مستحسن رائے کو اختیار کرتے۔ امام ابوحنیفہ نے قیاس و استحسان کو واضح اصولوں پر قائم کیا۔

امام مالک نے تعامل اہل مدینہ کو حجت قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب بعض روایات کو قرآن کریم کی نصوص کے برخلاف ہونے کے اصول کی بنیاد پر رد کیا[1]

اصول فقہ کی تدوین اصول فقہ کی باقاعدہ تدوین کلام کا آغاز امام شافعی نے الرسالہ کی تصنیف سے کیا جس میں بقول فخر الدین رازی انہوں نے دلائل شریعت کے فہم کا قانون کلی وضع کیا اور بتایا کہ ان دلائل کے کیا مراتب ہیں اور ان کو ایک دوسرے پر کیا ترجیح حاصل ہے۔ بدر الدین زرکشی اپنی کتاب البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ

---

[1] ابو زہرہ اصول الفقہ ص ۹ - ۱۰

پہلے شخص ہیں جنہوں نے اصول فقہ پر اولین کتاب الرسالہ تصنیف کی ۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ اس فن میں تالیف کا کام سب سے پہلے امام شافعیؒ نے کیا انہوں نے اپنی تصنیف الرسالہ میں اوامر و نواہی، بیان، خبر، نسخ اور منصوص علت کا حکم وغیرہ جیسے امور بیان کئے ہیں ۔

اسنوی کہتے ہیں کہ اہل علم کے درمیان اس امر پر اتفاق ہے کہ اصول فقہ کے موضوع پر سب سے پہلی تصنیف امام شافعیؒ کا 'الرسالہ' ہے[1] ۔

امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف الرسالہ میں گفتگو اور سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا ہے اور اولاً قرآن اور سنت اور اجتہاد یعنی قیاس کے ذریعہ بیان کو ذکر کیا ہے اس کے بعد عام و خاص کا بیان ہے ۔ اطاعت رسول کے لازم ہونے کا بیان کرکے ناسخ و منسوخ کا ذکر کیا ہے ۔ خبر واحد اور اس کے قابل احتجاج ہونے کے دلائل کو اجماع اور قیاس کو ذکر کیا ہے ۔ بعد ازاں استحسان کا رد کیا ہے اور پھر اختلاف علماء کو بیان کیا ہے ۔ گویا الرسالہ اصول فقہ اور اصول حدیث کے مجموعی مضامین پر مشتمل ہے ۔ امام شافعیؒ کی اصول فقہ پر دو تصانیف اور بھی ہیں یعنی کتاب جماع العلم اور کتاب ابطال الاستحسان[2]

امام شافعیؒ کی الرسالہ کو علم اصول فقہ کی تاسیس اور اس کے نشو و ارتقاء میں امتیازی مقام حاصل ہے اور یہ کتاب اصول فقہ کے بعد میں آنے والی تصانیف پر کسی نہ کسی صورت میں اثر انداز رہی ہے ۔ چنانچہ بعض اصولیین نے الرسالہ کی شرح لکھی اور اس کے بعض موجز موضوعات کی تشریح کی اور بعض نے الرسالہ سے اخذ و استنباط کرکے اس کے بعض موضوعات کی مزید توضیح کی اور نئے مضامین کو تسلیم کرتے ہوئے امام مالک کے تعامل اہل مدینہ کے اثبات میں دلائل فراہم کئے اور استحسان اور مصالح مرسلہ اور الذرائع کا اضافہ کیا حنبلی مسلک کے فقہاء نے تقریباً وہی طرز اختیار کیا جو مالکی مسلک کے فقہاء نے کیا ہے ۔ بالخصوص شافعی مسلک کے فقہاء نے امام شافعیؒ کے اصول کی توضیح کی اور ان کے فقہ و اجتہاد پر امام شافعیؒ کے الرسالہ میں بیان کردہ اصول پر

---

[1] صالح بن عبد العزیز المنصور اصول الفقہ ابن تیمیہ ۱/ ۲۵ الطبعۃ الاولی ۱۹۸۰ء

[2] بحوالہ مذکور ص ۲۹

دور میں حاوی رہے اور امام شافعیؒ کے بیان کردہ چار اصول شریعت کتاب و سنت اجماع اور قیاس پر سب کا اتفاق رہا[1]

امام شافعیؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ نے بھی اصول فقہ پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا ذکر ابن الندیم نے کیا ہے۔ ابو اسحاق مروزی نے ایک کتاب "الخصوص والعموم" تالیف کی داؤد ظاہری نے علم الاصول کے مختلف موضوعات پر متعدد کتب تالیف کیں۔

مذکورہ بالا جملہ تصانیف اور اسی دور کی دیگر کتب اصول فقہ کے جزوی موضوعات کا اثبات یا ان کی آراء کی تردید کرتا تھا۔ اصول فقہ میں تصانیف کے سلسلہ کا آغاز ۳۳۰ھ کے بعد اس وقت ہوا جب ابو بکر الصیرفی نے امام شافعیؒ کے الرسالہ کی شرح تالیف کی انہوں نے اجماع کے موضوع پر ایک مستقل کتاب تالیف کی اور اسی طرح اصول فقہ پر البیان فی دلائل الاعلام علی اصول الاحکام کے نام سے ایک کتاب تالیف کی[2]

چوتھی صدی ہجری کے آخری حصے میں اصول فقہ کے موضوع پر جدید اور موثر تصنیفی تحریک پیدا ہوئی اور اس کا آغاز فقہاء متکلمین قاضی ابو بکر الباقلانی اور قاضی عبد الجبار معتزلی کی تالیفات سے ہوا چنانچہ زرکشی نے کہا کہ ان دونوں متکلمین کی تالیفات سے اصول فقہ کے مضامین میں پایا جانے والا اجمال رفع ہوا اور موضوع کو نیا توسع حاصل ہوا[3]

پانچویں صدی ہجری میں تدوین اصول فقہ کا قابل لحاظ کام ہوا اور ہر مسلک کے فقہاء نے اپنے اصول مرتب کئے اور ان کے دلائل بیان کئے ابو الحسن محمد بن علی البصری نے قاضی عبد الجبار کی تالیف کی شرح لکھی اور کئی تصانیف کیں جن میں سے زیادہ مشہور المعتمد فی اصول الفقہ ہے۔ اسی دور میں ابو زید ابو موسیٰ نے تاسیس النظر ابن حزم اندلسی نے الاحکام فی اصول الاحکام اور ابو اسحاق شیرازی نے اللمع والتبصرہ فی اصول الفقہ تالیف کی اور پانچویں صدی ہجری کے آخر میں امام الحرمین الجوینی

---

[1] اصول الفقہ لابی زہرہ ص ۱۴

[2] صالح بن عبد العزیز اصول الفقہ ص ۳۰ - ۳۱

[3] ایضاً

نے البرہان تحریر کی۔

تاسیس النظر کے علاوہ باقی مذکورہ کتب کی تالیف متکلمین کے اسلوب پر ہوئی ہے۔ اصولِ فقہ میں متکلمین کا اسلوب نگارش یہ تھا کہ فقہی جزئیات سے صرف نظر کرکے اصول کو عمومی کلیات کی صورت میں عقلی دلائل کی روشنی میں بیان کرتے تھے اور جستہ جستہ کلامی مباحث بھی ذکر کر دیتے تھے۔

'تاسیس النظر' میں ابوالحسن الکرخی اور الجصاص کے بیان کردہ مضامین کو قدرے توسع کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور حنفی فقہاء کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے اصول کے ضمن میں مسائل جزئیہ کو تفریعات اور فقہی نکات پر مشتمل قواعد اور مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔

پانچویں صدی ہجری کے آخر میں امام الحرمین جوینی نے ارسطو کے اسلوب میں اصول فقہ پر کتاب البرہان تالیف کی۔ امام غزالی جوینی کے شاگرد ہیں، انہوں نے بھی اصول الفقہ کی تالیف میں اپنے استاد کا منہاج اختیار کیا ہے۔

تاسیس النظر کے بعد حنفی فقہاء کی اہم تصانیف فخر الاسلام البزدوی کی کنز الوصول الی معرفۃ الاصول اور السرخسی کی اصول الفقہ ہے[1]

امام شافعیؒ کی تصنیف کے بعد اصول الفقہ کے موضوع پر تالیف کے دو اسالیب نے نشوونما پائی۔ کلامی اسلوب اور فقہی اسلوب۔

کلامی اسلوب کلامی اسلوب متکلمین فقہاء نے اختیار کیا اس اسلوب نگارش میں تحریر کی جانے والی کتابوں میں بنیادی اہمیت اصول اور قواعد کو دی گئی اور ان کی توضیح فقہی جزئیات سے صرف نظر کرکے عقلی استدلال کی روشنی میں کی گئی۔ فقہی جزئیات سے اصولوں کو منضبط کرنے کے بجائے اصول جزئیات کو منضبط کرنے والے قرار پاتے۔ اس طرز نگارش کے اصولیین فقہی مسلک کو پیش نظر رکھے بغیر اصول کی تحقیق کرتے ہیں اور اس امر کی سعی کرتے ہیں کہ مضبوط اور مدلل اصول و قواعد وضع کیے جائیں خواہ ان سے ان کے فقہی مسلک کی تائید ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔ یہی طرز شافعی فقہاء نے بھی اختیار کیا اور اس

---

[1] صالح بن عبد العزیز اصول الفقہ ۳۴ بعد

وجہ سے اس طریقہ کو اصول الشافعیین بھی کہا جاتا ہے مثلاً امام شافعیؒ اجماع سکوتی کے قائل نہیں ہیں مگر آمدی جو شافعیؒ مسلک کے فقیہ ہیں اجماع سکوتی کو حجت قرار دیتے ہیں۔ اس طریقہ تصنیف میں کلامی اور منطقی مباحث بھی اصولی مباحث کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں چنانچہ اس طرز کی تصانیف میں تحسین و تقبیح عقلی پر اور عصمت انبیاء جیسے نظری اور کلامی موضوعات پر بھی مباحث ملتے ہیں جو فقہی احکام کے اخذ و استنباط کے عمل میں کسی واضح افادیت کے حامل نہیں ہیں[1]

اس اسلوب کی اہم تصانیف حسب ذیل ہیں :

۱۔ ابوالحسن محمد بن علی البصری	المعتمد
۲۔ امام الحرمین الجوینی	البرہان
۳۔ امام غزالیؒ	المستصفی

امام فخر الدین رازی نے ان تینوں تصانیف کے مضامین کو یکجا کیا اور مزید توسع کے ساتھ المحصول تحریر کی۔

"المحصول" کا متعدد فقہاء نے اختصار کیا اور پھر ان کتب کی شروح لکھی گئیں۔ ان مختصرات میں تاج الدین محمد بن ارموی کی الحاصل زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہی اختصار قاضی بیضاوی کی منہاج الوصول الیٰ علم الاصول کی اساس بنی جس کی شرح جمال الدین الاسنوی شافعیؒ نے 'نہایۃ السول فی شرح منہاج الوصول الی علم الاصول' کے نام سے تحریر کی۔ سیف الدین آمدی نے بھی 'المحصول' کی تلخیص کی اور اس پر مزید اضافے کئے۔ ان کی کتاب کا نام 'الاحکام فی اصول الاحکام' ہے۔ اس کتاب کی محمد بن حسن مالکیؒ نے شرح لکھی اور ابن حاجب مالکی نے اپنی کتاب 'منتہی السول والامل فی علمی الاصول والجدل' میں تلخیص کی۔ خود ابن حاجب نے اپنی اس مختصر کا بھی اختصار کیا اور اس کا نام مختصر المنتہی رکھا جس کی علامہ عضدالدین الایجی نے شرح لکھی[2]

---

[1] بحوالہ مذکور۔ ابو زہرہ اصول الفقہ ص ۳۹ - ۴۰

[2] صالح بن عبدالعزیز اصول الفقہ ص ۴۲ - ابو زہرہ اصول الفقہ ص ۱۲

جملہ فقہاء کرام نے علی العموم اور حنفی فقہاء نے خصوصیت کے ساتھ اصول نگاری کا "فقہی اسلوب" اختیار کیا۔ اس اسلوب کے نمایاں خصائص حسب ذیل ہیں۔

فقہی اسلوب اس طریقہ تحریر میں اصول وقواعد ائمہ فقہاء سے منقول فروع اور جزئیات کے تابع ہوتے ہیں یعنی فقہاء ان قواعد کو بیان کرتے ہیں جو انکے ائمہ فقہاء سے منقول جزئیات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ مسالک فقہ کے ائمہ نے ایسی اصولی کتب نہیں تالیف کیں جن سے ان کے طریقہ پر استنباط اور منہاج فقہ کی توضیح ہوتی ہو۔ اس لیے بعد کے فقہاء کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ ائمہ سے منقول فروعی مسائل اور جزئیات کو مدنظر رکھ کر قواعد وضع کریں یا ان اصول کو بنائیں جو ان کے ائمہ مسلک کے استدلال میں بر سبیل تذکرہ آگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حنفی فقہ کے دور استنباط میں انکے یہاں اصول موجود نہیں تھے اسلیے انہوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے درمیان اختلاف کا مبنیٰ وہ اصول ہیں جو اصول بزدوی وغیرہ میں مذکور ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان اصولوں کی تخریج ائمہ فقہاء کے اقوال پر کی گئی ہے[1]

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلک حنفی کے اصول خود ائمہ مسلک کے وضع کردہ نہیں ہیں یہ تدوین بعد میں ہوئی مگر یہ بات طے ہے کہ ان میں سے اکثر اصول کی ائمہ فقہاء کے اقوال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور ان اصولوں کی ترتیب اور تدوین بعد میں آنے والے فقہاء نے کی ہے اور یہی اصول شافعیہ اور اصول حنفیہ میں فرق وامتیاز کی بنیاد ہے کہ اصول شافعیہ استنباط کا منہاج مقرر کرتے ہیں اور ان کا استنباط واستدلال ان اصولوں کے تابع ہوتا ہے جبکہ حنفی اسلوب میں یہ صورت نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے مسلک کی جزئیات کو مدنظر رکھ کر قواعد واصول کی بایں طور تشکیل کی کہ ان سے فقہی جزئیات کو تائید حاصل ہو۔

مذکورہ اسلوب کی اگرچہ بظاہر افادیت کم محسوس ہوتی ہے لیکن فقہی بصیرت کو نشوونما دینے میں یہ طریقہ زیادہ موثر ہے کیونکہ

---

[1] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف۔

۱ : اس طرز کے تحت اصول اجتہاد فقہی بصیرت کے تابع رہتے ہیں اور ایسے مستقل قواعد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن کا دیگر قواعد سے موازنہ کیا جا سکتا ہے اور موازنہ کی مدد سے عقل زیادہ بہتر قواعد کی جانب راہنمائی حاصل کر لیتی ہے۔

۲ : اس اسلوب کے تحت اصول و قواعد عملی تطبیق سے جدا محض نظریاتی مبحث نہیں رہتے بلکہ ضوابط و کلیات کی حیثیت میں جزئیات اور فروع پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس طرح تطبیق سے ان کلیات اور ضابطوں میں مزید استحکام اور قوت پیدا ہوتی ہے۔

۳ : اصول کے اس طریقے پر مطالعے سے فقہی تقابلی مطالعہ تشکیل پاتا ہے کیونکہ عملاً اس طریقے میں موازنہ جزئیات میں نہیں ہوتا بلکہ ان پر مشتمل کلیات اور اصول میں ہوتا ہے اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ فقہ کا طالب علم فقہ کی جزئیات پر ارتکاز توجہ کرنے کے بجائے متعدد جزئیات کا ان کلیات کے تحت جائزہ لیتا ہے جو انہیں منضبط کرتی ہیں۔

۴ : تحقیق و مطالعہ کے اس اسلوب سے تخریج و تفریع کی تربیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس ذہنی تربیت کی مدد سے پیش آمدہ جزئی مسائل کے حکم کا استنباط سہل ہو جاتا ہے جو ائمہ فقہاء کے دور میں موجود نہیں تھے نیز یہ کہ ان نئے پیش آنے والے مسائل کا حل ائمہ کی آراء و اقوال کے مطابق ہوتا ہے کیونکہ یہ حل بھی انہی اصول و قواعد کے تابع ہے جو ائمہ فقہاء کے مدنظر تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے فقہاء ائمہ مذاہب سے منقول آراء پر اکتفاء کئے بغیر ان میں توسع اور اضافہ کرتے رہتے ہیں [1]

فقہی اسلوب کی اہم تصانیف

اس اسلوب پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ابوالحسن الکرخی کی اصول ہے جو اصول الکرخی کے

---

[1] ابوزہرہ اصول الفقہ ص ۱۷، ۱۸

نام سے متعارف ہے۔ اسی طرح ابوبکر جصاص کی اس موضوع پر تصنیف زیادہ اہم ہے اور اس کے بعد عبیداللہ بن عمر الدبوسی کی تالیف تاسیس النظر ہے۔ اس طرز نگارش میں زیادہ عمدہ تالیف فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی کی تصنیف 'کنز الوصول الی معرفۃ اصول' ہے جس کی شرح عبدالعزیز احمد البخاری نے کشف الاسرار کے نام سے کی ہے جو اصول البزدوی کی شروح میں زیادہ مشہور ہے۔ علامہ سرخسی جو حنفی فقہ کی مشہور کتاب المبسوط کے مؤلف ہیں ان کی بھی اصول پر ایک کتاب ہے۔

اس مقام پر یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اصول کی کتابوں کی تالیف کا فقہی اسلوب صرف حنفی فقہا تک محدود نہیں رہا بلکہ شافعی مالکی اور حنبلی مسلک کے فقہا نے بھی اپنی تصانیف میں اس اسلوب تحریر کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً علامہ قرافی مالکی نے اپنی تصنیف 'تنقیح الفصول علی الاصول' میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور علامہ اسنوی شافعی کی 'التمہید فی تخریج الفروع علی الاصول' بھی اسی اسلوب تحریر کی عکاس ہے۔ اسی طرح شہاب الدین محمود بن احمد زنجانی کی تصنیف 'تخریج الفروع علی الاصول' ہے۔ اس میں انہوں نے الدبوسی کے طرز پر ابواب فقہ کے ہر باب کی جزئیات بیان کر کے ان اصولوں کی توضیح کی ہے جن کے تحت یہ جزئیات مستنبط ہوتی ہیں۔ شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہؒ ان کے والد شہاب الدین عبدالحلیم اور ان کے جد امجد مجد الدین عبدالسلام بن تیمیہ نے اسی اسلوب کے مطابق تالیفات کیں۔

اصول فقہ پر جامع تصانیف

کلامی اسلوب اور فقہی اسلوب دونوں طرز کے اسلوب تحریر مستحکم و مروج ہو جانے کے بعد ان دونوں اسالیب کی جامع کتب بھی تالیف کی گئی چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں حنفی اور شافعی فقہا نے اپنی تالیفات نقل دلائل سے اصولی قواعد کی تحقیق کر کے انہیں فقہی فروع پر مرتب کیا۔ اس طرز کی اہم تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ مظفر الدین احمد بن علی ساعاتی نے فقہی اسلوب پر لکھی گئی اصول البزدوی اور کلامی اسلوب پر تالیفات شدہ آمدی کی الاحکام فی اصول الاحکام کے مضامین کو

اپنی تصنیف میں جمع کیا اور اس کا نام " بدیع النظام الجامع بین کتابی البزدوی والاحکام ، رکھا ۔

۲ ۔ صدر الشریعہ عبداللہ بن مسعود حنفی نے اسی اسلوب پر " التنقیح " کے نام سے تالیف کی جس میں انہوں نے البزدوی کی اصول ابوبکر رازی کی " المحصول " اور ابن حاجب مالکی کی " منتہی السول والامل " کے مضامین کو یکجا کیا اور خود ہی التوضیح کے نام سے اس کی شرح تصنیف کی اور سعد الدین تفتازانی نے " التلویح " کے نام سے اس کے حواشی لکھے ۔

۳ ۔ تاج الدین عبدالوہاب بن علی السبکی کی " جمع الجوامع " ۔

۴ ۔ کمال الدین بن الہمام کی التحریر جس کی محمد بن محمد بن امیر حاج نے التقریر والتحریر کے نام سے شرح لکھی اور اسی کتاب کی ایک مشہور شرح " تیسیر التحریر فی اصول الفقہ " ہے جس کے مولف محمد امین المعروف بائیر بادشاہ ہیں ۔

۵ ۔ محمد بن عبداللہ الشوکانی کی " ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من الاصول " برصغیر کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خان نے " حصول المامول من علم الاصول " کے نام سے اس کی تلخیص کی لے

اصول فقہ کی تصانیف میں علی العموم استنباط کے اصول وقواعد کی توضیح اور دلائل شریعت کے بیان اور ان سے اخذ احکام کے بیان کو زیادہ اہمیت حاصل رہی اور مقاصد ومصالح شریعت اور اخذ واستنباط کے عمل میں مصالح شریعت کی رعایت پر زیادہ بسط وتفصیل سے توجہ نہیں دی گئی ۔ یہاں تک کہ آٹھویں صدی ہجری میں علامہ ابواسحاق الشاطبی نے " الموافقات فی اصول الشریعۃ " تالیف کی جس میں انہوں نے اصول شریعت اور مناہج اجتہاد بیان کرنے کے ساتھ شریعت کے مصالح اور مقاصد کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا اور بڑے مدلل انداز میں

لے ابوزہرہ اصول الفقہ ص ۱۸ ، ۱۹ ۔ صالح بن عبدالعزیز اصول الفقہ ص ۴۵ بعد الدکتور محمد ادیب صالح ، مقدمہ تخریج الفروع علی الاصول للزنجانی

حکم التشریع پر کلام کیا۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی اہم تصنیف محب اللہ بن عبد الشکور حنفی کی 'مسلم الثبوت' کا بھی ذکر کر دیا جائے جس کی متعدد شروح لکھی گئیں جن میں سے علامہ عبدالعلی بحر العلوم کی شرح فواتح الرحموت اہمیت کی حامل ہے[1]

اصول فقہ کا موضوع تفصیلی دلائل شریعت کے ذریعہ عملی احکام معلوم کرنا اور استنباط و استدلال کے طریقے بیان کرنا اصول فقہ کا موضوع ہے یعنی دلائل شریعت کا فہم و ادراک اور ان دلائل سے استخراج و استنباط کا مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ کس موقعہ اور کس مناسبت سے کونسا شرعی حکم وارد ہوا ہے اور یہ کہ جب کوئی مکلف شخص کوئی فعل یا عملی کام کرتا ہے تو شریعت کی نظر میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ لازم و واجب یا جائز و روا یا حرام و ممنوع اور درحقیقت شریعت کا مکلف کے افعال کا یہ وصف بیان کرنا ان کا حکم کہلاتا ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ فقہ اور اصول فقہ دونوں علوم کا نتیجہ اور فائدہ حکم شریعت معلوم کرنا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اصول فقہ اس حکم کے مناہج اور مصادر بیان کرتا ہے جبکہ فقہ میں عملاً احکام کا استنباط ہوتا ہے۔ حکم کے لیے ضروری ہے کہ کوئی حاکم ہو، حاکم اللہ سبحانہ ہے اسی نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری اور دائمی شریعت بذریعہ وحی نازل فرمائی اور آپ کو احکام الٰہی کے بیان و توضیح کا منصب عطا فرمایا۔

"لتبین للناس ما نزل الیھم" (تاکہ آپ لوگوں کے سامنے بیان و توضیح کر دیں کہ ان کی جانب کیا احکام نازل کیئے گئے ہیں)۔ کیونکہ شریعت کا نازل کرنے والا اللہ سبحانہ ہے اس لیے اللہ شارع ہے اور خود اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان اور توضیح کا منصب عطا فرمایا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شارع ہیں۔ شارع کے احکام معلوم کرنے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ ان دلائل اور مصادر کا علم حاصل کیا جائے جن کے ذریعہ احکام شریعت کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔

---

[1] زبید احمد عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ۔

اجتہاد قرآن و سنت کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں روح شریعت کے مطابق کیا جاتا ہے اس لیے قواعد استنباط کا جاننا بھی ضروری ہے ۔ احکام شریعت کا اطلاق مکلف کے افعال و اعمال پر ہوتا ہے اس لیے مکلفین کے افعال محکوم فیہ ہیں اور کیونکہ مکلف ان احکام کا پابند ہوتا ہے اس لیے وہ محکوم علیہ کہلاتا ہے اور اس اعتبار سے یہ گفتگو ہوتی ہے کہ محکوم علیہ کی وہ کون سی حالت اور کیفیت ہوتی ہے جس میں وہ احکام کی ادائیگی کا اہل ہوتا ہے اور مکلف کو وہ کون سے عوارض پیش آتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ادائے احکام کا اہل نہیں رہتا ۔

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ اصول فقہ میں جو موضوعات زیر بحث آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

ا ۔ حکم شریعت

ب ۔ حاکم یعنی اللہ سبحانہ

ج ۔ وہ ذرائع اور دلائل جن سے احکام شریعت کا علم حاصل ہوتا ہے یعنی دلائل شریعت یا ماخذ شریعت یا مصادر شریعت ۔

د ۔ قواعد استنباط یعنی قرآن و سنت سے استنباط احکام کے قواعد ۔

ھ ۔ محکوم فیہ یعنی مکلف کے افعال و اعمال ۔

و ۔ محکوم علیہ یعنی خود مکلف اور اس کی اہلیت اور عدم اہلیت کی کیفیات ۔